Downloaded From
Paksociety.com

عمیرہ احمد

آب حیات کی کہانی تانی کے تیرہ چہروں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر تفصیلی معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

3۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال

Downloaded From
Paksociety.com

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی تیجلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

اکیسویں قسط

www.paksociety.com

تبارک الذی

پریذیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اس نے زندگی میں بھی اتنی کافی نہیں پی تھی مگر زندگی میں کبھی اسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہد صدارت میں بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔

کانگریس کے انتخابات سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان انتخابات کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ "بری طرح" کا لفظ شاید ناکافی تھا' اس کی پارٹی دراصل الیکشن ہار جاتی' لیکن اس فیصلے کو رد کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا' ٹال چکا تھا' جتنا کھینچ سکتا تھا' کھینچ چکا تھا۔ اب اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ کچھ حلقوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ طاقت ور لوگ دبے لفظوں میں اپنی ناراضی اور شدید ردعمل سے اسے خبردار کر رہے تھے۔ فارن آفس اسے مسلسل متعلقہ ممالک سے امریکی سفارت خانوں کی تقریباً" روزانہ کی بنیاد پر آنے والے خدشات اور استفسارات کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا اور خود وہ ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا تھا۔ امریکہ کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی مگر اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے' اپنی کابینہ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر چند منٹ کا وقفہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اس بریک کے آخری چند منٹ گزار رہا تھا۔ میز سے کچھ کاغذات اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا' وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے کی طویل میٹنگ کے اہم نکات تھے۔ اس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبرز دو برابر گروپس میں بٹے ہوئے دو مختلف حلقوں کے ساتھ تھے۔ اس کا ووٹ فیصلہ کن قرار پاتا اور یہی چیز اسے اعصاب شکن کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں اسی کے سر پر آرہی تھی۔ یہ اس کے عہد صدارت میں ہوتا اور اس کے فیصلہ کن ووٹ سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو۔ اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود کسی اور کے سر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہائٹ ہاؤس اس وقت حقیقتاً" اسے ہلنسی کی طرح لگ رہے تھے۔ بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے کے ہاتھوں کو خود جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔

اور تاریخ 17 جنوری 2030 کو بھی یہی کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہشام نے پہلی بار اس لڑکی کو سوڈان میں دیکھا تھا۔ UNHCR (اقوام متحدہ کا ہائی کمیشن برائے پناہ گزین) کے ایک کیمپ میں کسی پناہ گزین کونگی عورت کے ساتھ اشاروں میں بات کرتے اور اسے کچھ سمجھاتے ہوئے۔ وہ پاکستانی یا انڈین تھی۔ ہشام نے اس کے نقوش اور رنگت سے اندازہ لگایا تھا اور پھر اس کے گلے میں لٹکے کارڈ پر اس کا نام پڑھ کر اسے اس کا نام پتا چل گیا تھا۔

بے حد معمولی شکل و صورت کی ایک بے حد دبلی پتلی گھنے بالوں والی سانولی رنگت کی ایک دراز قامت لڑکی۔ اس کا پانچ فٹ سات انچ قد اس کی واحد خصوصیت لگی تھی اس پہلی ملاقات میں ہشام کو۔

وہ ایک عورت سے بات کرتے کرتے ہشام کی طرف متوجہ ہوئی' ایک ساتھی کارکن کے طور پر اسے مسکراہٹ دی اور ہاتھوں کے اشارے سے ہیلو اور حال چال پوچھا' اس لڑکی نے بھی ہاتھوں کے اشارے سے اس کو جواب دیا۔ دونوں نے بیک وقت اپنے گلے میں لٹکے کارڈز پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے اور اس پر انگلی پھیرتے

www.paksociety.com

ہوئے جیسے خود کو متعارف کرایا۔ وہ CARE کی ورکر تھی' وہ ریڈ کراس کا اور وہ دونوں یو ایس اے سے آئے تھے۔ رسمی تعارف اور وہاں کے حالات کے بارے میں اشاروں میں ہی بات کرنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

ان کی دوسری ملاقات دوسرے دن ہوئی تھی۔ لکڑی کے عارضی باتھ روم کی تنصیب و تعمیر والی جگہ پر۔۔۔ وہ آج بھی اس سے پہلے وہاں موجود تھی اور کچھ تصویریں لے رہی تھی۔ وہ کچھ سامان لے کر وہاں آیا تھا۔ ایک لوڈر گاڑی میں۔۔۔ دونوں نے ایک بار پھر اشاروں کی زبان میں رسمی علیک سلیک کی۔

تیسری ملاقات لمبی تھی' وہ ایڈ ورکرز کے ایک ڈنر میں ملے تھے۔۔۔ ڈنر ہال کے باہر کوریڈور میں۔۔۔ دونوں دس منٹ تک اشاروں کی زبان میں بات کرتے رہے۔۔۔ وہ پاکستان سے تھی' وہ بحرین سے۔۔۔ وہ نیویارک یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا' وہ بھی یونیورسٹی نیویارک میں۔۔۔ وہ فنانس کا اسٹوڈنٹ تھا' وہ سوشل سائنسز کی۔۔۔ اور ان دونوں کے درمیان صرف ایک چیز مشترک تھی۔۔۔ رفاہی کام' جس سے وہ دونوں اپنی نو عمری سے وابستہ تھے۔۔۔ ان دونوں کا نصابی سی وی اتنا لمبا نہیں تھا جتنا ان کی غیر نصابی سرگرمیاں۔۔۔

کوریڈور میں گزارے ان دس منٹوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ پوچھا اور جانا تھا۔۔۔ اشاروں کی زبان میں سوالات بہت تفصیلی نہیں تھے' لیکن ہشام کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے اور بھی سوال کرتا۔۔۔ وہ قوت گویائی رکھتی تو وہ کر ہی لیتا۔۔۔ اس کے ساتھ کھڑے اس نے سوچا تھا۔۔۔ وہ اسے اس شام اتنی ہی دلچسپ لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہمیشہ کی طرح مل کر آگے بڑھ جاتے۔۔۔ اس کوریڈور سے بہت سارے گزرنے والے ایڈ ورکرز میں سے ایک جوان دونوں کو جانتا تھا اس نے انہیں بلند آواز میں دور سے مخاطب کرتے ہوئے ہیلو کہا اور ساتھ حال احوال دریافت کیا۔ وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بیک وقت اس کی ہیلو کا جواب دیتے ہوئے جواباً" اس کی خیریت دریافت کی اور پھر دونوں نے بیک وقت کرنٹ کھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔۔۔ گنگ ہو کر۔۔۔ اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔۔۔ اور ہنستے ہی گئے تھے۔۔۔ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ۔۔۔ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ان کے پاس اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا اس وقت۔۔۔ ان دونوں کا پہلا تعارف "خاموشی" نے کرایا تھا اور وہ خاموشی ہمیشہ ان کے ہر جذبے کی آواز بنی رہی۔۔۔ وہ جیسے ان کا سب سے دلچسپ کھیل تھا۔۔۔ جب ایک دوسرے سے کچھ بھی خاص کہنا ہوتا تو اشاروں کی زبان میں بات کرنے لگتے۔۔۔ ہنستے کھلکھلاتے بوجھتے' بجھاتے' سمجھتے۔۔۔ کیا کھیل تھا۔۔۔!!

وہ اس وقت یونیورسٹی میں نو وارد تھے۔۔۔ ہشام کو حیرت تھی ان کی ملاقات اس سے پہلے کیوں نہیں ہوئی۔ وہ دونوں ایک جیسی رفاہی ایجنسیوں کے ساتھ کام کر رہے تھے' لیکن اس سے پہلے وہ صرف امریکہ کے اندر ہی طوفانوں اور سیلابوں کے دوران ہونے والے ریلیف ورک سے منسلک رہے تھے' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں امریکہ سے باہر ہونے والے کسی ریلیف کیمپ میں حصہ لینے کے لیے گئے تھے۔

نیویارک واپسی کے بعد بھی ان دونوں کا رابطہ آپس میں ختم نہیں ہوا تھا۔۔۔ وہ مختلف یونیورسٹیز میں ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے وقتاً" فوقتاً" مختلف سوشل ایونٹس میں بھی ملتے رہتے تھے کیونکہ دونوں مسلمان طلبہ کی تنظیم سے بھی وابستہ تھے۔۔۔ اور پھر یہ رابطہ وقتاً" فوقتاً" ان سوشل ایونٹ سے ہٹ کر بھی ہونے لگا۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی فیملی سے بھی مل چکے تھے اور اب بہت باقاعدگی سے ملنے لگے تھے۔ دونوں کے والد ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

ہشام امریکا میں بحرین کے سفیر کا بیٹا تھا اور بحرین کے سفارت خانے میں ہونے والی اکثر محفلوں میں اسے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں ایک فلسطینی نژاد ڈاکٹر تھی اور اس کا باپ امریکہ کے علاوہ بہت سے یورپین ممالک میں

www.paksociety.com

بحرین کی نمائندگی کرچکا تھا۔ دو بہن بھائیوں میں وہ بڑا تھا اور اس کی بہن ابھی ہائی اسکول میں تھی۔

رفاہی کاموں میں دلچسپی ہشام کو اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی جو ہشام کے باپ سے شادی سے پہلے ریڈ کراس کے ساتھ منسلک تھی اور فلسطین میں ہونے والے ریلیف کیمپس میں اکثر ان امدادی ٹیموں کے ساتھ جاتی تھی جو امریکہ سے جاتی تھیں شادی کے بعد اس کا وہ کام صرف فنڈز اکٹھے کرنے اور عطیات تک محدود رہ گیا تھا مگر ہشام نے اپنی ماں فاطمہ سے یہ شوق وراثت میں لیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ شوق بڑھتا ہی گیا تھا۔

اس لڑکی سے ملنے کے بعد اسے اپنا شوق اور جنون بہت کم اور کمتر لگا تھا۔ وہ اپنی کم عمری میں جن رفاہی پروگراموں کے ساتھ منسلک رہی تھی بہت کم ایسا ہوا تھا کہ ریلیف آپریشن کے بعد بہترین خدمات کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں میں اس کا نام نہ ہوتا۔

اس سے میل جول کے آغاز ہونے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ ان کے درمیان انسانیت کی خدمت کا جذبہ ایک واحد مشترک چیز نہیں تھی اور بھی بہت سی دلچسپیاں مشترکہ تھیں اور صرف دلچسپیاں اور مشاغل ہی نہیں۔۔۔ خصوصیات بھی۔۔۔ دونوں کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور بہت زیادہ۔ دونوں کو تاریخ میں دلچسپی تھی۔۔۔ دونوں گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور دونوں بہت زیادہ باتونی نہیں تھے۔۔۔ سوچ سمجھ کر بات کرنے کے عادی تھے۔

ہشام کی پوری زندگی مخلوط تعلیمی ماحول اور معاشرے میں گزری تھی۔۔۔ نہ اس کے لیے لڑکیاں نئی چیز تھیں نہ ان سے دوستی۔۔۔ لیکن زندگی میں پہلی بار وہ کسی لڑکی سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کا کبھی کوئی آئیڈیل نہیں رہا تھا لیکن اسے لڑکیوں کی جو خوبیاں متاثر کرتی تھیں ان میں سے کوئی بھی چیز اس لڑکی میں نہیں تھی۔۔۔ نہ وہ حسین تھی۔۔۔ نہ اسٹائلش' نہ ایسی ذہین کہ اگلے کو چاروں شانے چت کردے' لیکن اس کے باوجود وہ اسے کسی مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔۔۔ نظر کا ایک جدید انداز کا چشمہ لگائے وہ سادہ سی جینز اور کرتیوں میں اکثر دیگر جدید تراش خراش کے لباس اور اسٹائلش جوتوں والی لڑکیوں کے سامنے ہشام کو زیادہ پرکشش محسوس ہوتی تھی۔۔۔ خود میں مگن' دوسروں سے بے نیاز۔۔۔ کالرڈ کرتیوں اور شرٹس میں سر کے بال جوڑے کی شکل میں باندھے اپنی لمبی پتلی گردن کو کسی راج ہنس کی طرح اٹھائے وہ ہمیشہ اسے فون یا ٹیبلٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے حال میں مگن ملتی تھی' ان بہت سی دوسری لڑکیوں کے برعکس جو اسے دیکھتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ ہشام عرب تھا' عورت کی اداؤں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اداؤں ہی سے گھائل ہونے والا' لیکن اس لڑکی کے پاس کوئی ادا سرے سے تھی ہی نہیں' اس کے باوجود وہ گھائل ہو رہا تھا۔

"میرے معاشرے میں اگر مرد کسی عورت کے ساتھ کہیں جائے تو کھانے کا بل وہ دیتا ہے' عورت نہیں۔"

ہشام نے پہلی بار اسے باہر کھانے کی دعوت دی تھی اور بل کی ادائیگی کے وقت اسے پرس نکالتے دیکھ کر اس نے بڑی سنجیدگی سے روکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جواباً" مسکراتے ہوئے پرس سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے اس سے بولی۔

"اور میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ کسی بھی مرد کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اپنا بل خود دینا یہ تمہیں ہر خوش فہمی اور اسے ہر غلط فہمی سے دور رکھے گا۔۔۔ اس لیے یہ میرے حصے کا بل۔۔۔"

اس نے نوٹ میز پر رکھتے ہوئے ہشام سے کہا تھا۔ مسکرائی وہ اب بھی تھی۔ ہشام چند لمحوں کے لیے لاجواب ہوا تھا۔۔۔ وہ بڑا مہنگا ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا اور وہ جب بھی کسی لڑکی کو وہاں لا کر بل خود ادا کرتا تھا تو اسے اس لڑکی کی طرف سے بے حد ناز بھرا اور مصنوعی حیرت اور گرم جوشی سے بھرپور شکریہ وصول ہوتا تھا۔ مگر

www.paksociety.com

آج کچھ خلافِ توقع چیز ہو گئی تھی۔

"ریسٹورنٹ مہنگا تھا' میں اس لیے کہہ رہا تھا۔" وہ جملہ ——— ہشام کو اکیلے میں بھی دانت پیسنے پر مجبور کر رہا تھا ——— اس نے زندگی بھر کبھی کسی عورت کو ایسی توجیہ نہیں دی تھی۔

"شکریہ' لیکن میں بہت امیر ہوں۔" اس لڑکی نے جواباً مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے' تم میرا بل بھی دے سکتی ہو۔" پتا نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

"بل نہیں دے سکتی' لیکن بل دینے کے لیے ادھار دے سکتی ہوں۔" وہ جواباً اس سے بولی۔

"تو مہربانی کرو اور دے دو۔" ہشام نے اسی روانی سے کہا۔

وہ پہلی بار الجھی' اسے دیکھا پھر اس نے اپنے پرس سے بل کی بقایا رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی' ہشام نے خود رقم پکڑ کر بل پر رکھ کر اسے تہہ کرتے ہوئے ویٹر کی طرف بڑھا دیا۔

اس لڑکی نے اتنی دیر میں اپنا بیگ کھول لیا۔ وہ اس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی' چند لمحے گود میں رکھے بیگ میں ہاتھ مارتے رہنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی ڈائری نکالی اور پھر اس کے بعد قلم۔ میز پر ڈائری رکھ کر اس نے اس ڈائری میں اس رقم کا اندراج کیا جو اس نے کچھ دیر پہلے ہشام کو ادھار دی تھی۔ پھر اس نے قلم اور ڈائری دونوں ہشام کی طرف بڑھائے۔ اس نے کچھ حیران ہو کر دونوں چیزیں پکڑیں اور پھر اس سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" لیکن سوال کے ساتھ ہی اسے پہلی نظر ڈائری پر ڈالتے ہی جواب مل گیا تھا۔ وہ اس کے دستخط اس رقم کے سامنے چاہتی تھی جہاں اس نے ادھار دی جانے والی رقم لکھی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا' وہ اب اپنے گلاسز اتار کر انہیں صاف کرتے ہوئے دوبارہ لگا رہی تھی۔ معمول کی طرح خود میں محو اور اسے نظر انداز کیے یوں جیسے یہ سب روز مرہ کی بات تھی۔

ہشام نے قلم سنبھال کر دستخط کرنے سے پہلے ڈائری کے صفحے پلٹ کر بڑے تجسس سے لیکن محظوظ ہونے والے انداز میں دیکھا۔ وہاں چھوٹی بڑی رقموں کی ایک قطار تھی اور لینے والا صرف ایک ہی شخص تھا جس کا نام نہیں تھا' صرف دستخط تھے' مختلف تاریخوں کے ساتھ' لیکن کہیں بھی ادائی والے حصے میں کسی ایک رقم کی بھی ادائی نہیں کی گئی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اتنی حساب کتاب رکھنے والی ہو۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہو؟" ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اگر میں لکھوں گی نہیں تو بھول جاؤں گی اور معاملات میں تو شفافیت ضروری ہوتی ہے۔" اس لڑکی نے جواباً اطمینان کے ساتھ کہا' وہ اب اس سے ڈائری اور قلم لے کر واپس اپنے بیگ میں رکھ چکی تھی۔

"ڈائری سے تو لگتا ہے تم واقعی بہت امیر ہو۔ اتنی دریا دلی سے کس کو قرض دے رہی ہو؟" ٹیبل سے اٹھتے ہوئے ہشام نے اس کو کریدا' وہ بات گول کر گئی۔ ان کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اسے زیادہ کریدتا' مگر اس ڈائری میں کیے ہوئے اس آدمی کے دستخط اسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ اس دستخط کے انداز سے اتنا تو اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ کسی مرد کے دستخط تھے۔

ایک ہفتے بعد اس نے اس لڑکی کو وہ قرض واپس کرتے ہوئے اس کی ڈائری میں ادائی کے حصے میں اپنا دستخط ادا شدہ کی تحریر کے ساتھ کرتے ہوئے ایک بار پھر سے ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی۔ وہ ڈائری اس سال کی تھی اور سال کے شروع سے اس مہینے تک کسی صفحے پر کوئی ادائی نہیں تھی' لیکن ادھار لینے کی رفتار میں تسلسل تھا۔ چھوٹی بڑی رقمیں' لیکن لاتعداد بار۔

"اس سال تمہیں کوئی ادھار واپس کرنے والا میں پہلا شخص ہوں۔" ہشام نے جیسے بڑے فخریہ انداز میں کہا'

www.paksociety.com

http://rspk.paksociety

اس نے مسکرا کر اس سے ڈائری اور نوٹ دوبارہ واپس لیے' نوٹوں کو ہشام کے سامنے سے چھوٹے نوٹ نکال کر ہشام کو واپس کیے کیونکہ اس نے بڑے نوٹوں میں رقم واپس کی تھی۔ اور اس کے کچھ پیسے بچ رہے تھے۔

"چھوڑو' اسے رہنے دو۔" ہشام نے نوٹ واپس دینے کی کوشش کی۔ "اتنی بڑی رقم نہیں ہے یہ۔" اس نے جیسے لاپروائی سے کہا۔

"کافی کا ایک کپ اور ایک ڈونٹ آسکتا ہے' ایک وفل آئس کریم آسکتی ہے یا ایک برگر۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواباً کہا' وہ ہنسا۔

"تم واقعی ضرورت سے زیادہ حساب کتاب کرتی ہو۔"

"میری ماں کہتی ہے پیسہ مشکل سے کمایا جاتا ہے اور اس کی قدر کرتے ہوئے اسے خرچ کرنا چاہیے۔" اس نے جیسے ایک بار پھر ہشام کو لاجواب کیا تھا' ذرا سی شرمندگی دکھائے بغیر۔

"اس طرح تو تم واقعی بہت امیر ہو جاؤ گی۔" ہشام نے اسے چھیڑا۔

"ان شاء اللہ!" اس نے جواباً" اتنے اطمینان سے کہا کہ ہشام کو ہنسی آگئی تھی۔ ہنسنے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ یہ مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

"تمہیں برا تو نہیں لگا؟" اس نے کچھ سنبھلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا؟"

"میرا ہنسنا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے کیوں برا لگے گا۔۔۔ تم کیا مجھ پر ہنسے تھے؟" ہشام نے سر کھجایا' لڑکی سیدھی تھی' سوال ٹیڑھا تھا۔

"یہ جس کو اتنے اودھا رو دیتی رہی ہو' یہ کون ہے؟" اس نے بھی اس سے ایک ٹیڑھا سوال کیا تھا۔

"ہے کوئی۔" وہ ایک بار پھر نام گول کر گئی۔

"تم نام بتانا نہیں چاہتیں۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ہاں۔"

وہ چند لمحوں کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔ "بہت زیادہ قرضہ نہیں ہو گیا اس کے سر؟" اس کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"میں اسے انکار نہیں کر سکتی۔۔۔"

ہشام عجیب طرح سے بے چین ہوا۔ "پیسے کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔" شاید زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو ایسا مشورہ دیا تھا۔

"پیسے ہی نہیں' میں ہر معاملے میں احتیاط کرتی ہوں اس پر۔" اس نے بڑے آرام سے کہا تھا۔

ہشام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے؟ وہ ان کی دوستی کا آغاز تھا اور وہ ایک دوسرے کی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس شخص کا تعارف بھی ہشام سے بہت جلد ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تالیوں کی گونج نے حسین سکندر کی تقریر کے تسلسل کو ایک بار پھر توڑا تھا' روسٹرم کے پیچھے کھڑے چند لمحوں

www.paksociety.com

کے لیے رک کر اس نے تالیوں کے اس شور کے تھمنے کا انتظار کیا۔ وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹ کا اجتماع تھا اور وہ وہاں آغاز کرنے والے مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا۔ پچھلے سال وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس میں شامل تھا۔ سیلون اسکول آف مینجمنٹ سے امتیازی کامیابی کے ساتھ نکلنے والوں میں سے ایک اور اس سال وہ یہاں گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے خطاب کر رہا تھا۔ ایم آئی ٹی وہ واحد یونیورسٹی نہیں تھی جس نے اسے اس سال اس اعزاز کے قابل سمجھا تھا۔ لیگ آئی وی وائی کی چند اور نامور یونیورسٹیز نے بھی اسے مدعو کیا تھا۔

چوبیس سال کی عمر میں حمین سکندر پچھلے تین سالوں کے دوران دنیا کے بہترین منتظموں میں سے ایک مانا جا رہا تھا' اس ایک آئیڈیا کی وجہ سے جو پچھلے کچھ سالوں میں ایک بیج سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کے نام سے اس کی ڈیجیٹل فنانس کمپنی نے پچھلے تین سالوں میں گلوبل مارکیٹس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ دنیا کے 125 بہترین مالیاتی اور کاروباری ادارے اس کمپنی کے باقاعدہ کلائنٹس تھے اور ڈیڑھ ہزار چھوٹے ادارے بالواسطہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور یہ سب تین سال کی مختصر مدت میں ہوا تھا' جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کمپنی کی بنیاد رکھنے میں بھی مصروف تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کا تصور بے حد دلچسپ اور منفرد تھا اور ایک عام صارف کو وہ ابتدائی طور پر کسی ہندسوں کا کھیل جیسا لگتا۔ اس کی ابتدا ابھی حمین سکندر نے بے حد چھوٹے پیمانے پر کی تھی۔ ایک ویب سائٹ پر اس نے دنیا کی بہترین یونیورسٹیز کے اسٹوڈنٹس کو ایک آن لائن چیلنج دیا تھا۔ ایسا کوئی آئیڈیا فروخت کرنے کے لیے جس کے لیے انہیں یا تو سرمایہ چاہیے تھا یا کسی کمپنی کی سپورٹ اور یا پھر وہ اپنا آئیڈیا کسی خاص قیمت پر فروخت کرنے کے لیے تیار تھے' لیکن کاروبار اور کاروباری دونوں بے حد مختلف تھے۔

اس ویب سائٹ پر تین کورسز تھے۔ اے کیٹگری' بی اور سی کیٹگری۔ ہر کورس میں بیس سوالات تھے اور ویب سائٹ پر رجسٹریشن کے لیے ایک پاس ورڈ ضروری تھا جو اس کورس میں کامیاب ہونے کے بعد بھیجا جاتا اور وہی نمبر اس کاروبار کرنے والے کی ID تھی۔ کیٹگری اے کا کورس مشکل ترین تھا اور ناک آؤٹ کے انداز میں معین مدت کے لیے تھا۔ کیٹگری B اور C اس سے آسان تھے اور نہ کسی خاص مدت تک محدود تھے اور نہ ہی ان میں ناک آؤٹ ہوتا تھا۔ یہ ان تین کیٹگریز کی درجہ بندی تھی جو وہاں آنے والے ٹریڈرز کی پرفارمنس پر خودکار انداز میں انہیں مختلف کیٹگریز میں رکھتی تھی۔ جو A کیٹگری میں آگے نہ جا پاتا وہ B کے کورس میں حصہ لیتا اور جو B میں بھی آگے نہ جا پاتا تو وہ C میں اور جو C میں بھی آگے نہ جا پاتا تو اسے ٹریڈ این آئیڈیا کی طرف سے آؤٹ کر دیا جاتا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ ابھی اسے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ٹریڈنگ اس کا کام نہیں۔

اے کیٹگری کے کورس میں کامیاب ہو جانے والے غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد ایک پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے اور پھر اگلے مرحلے تک رسائی کرتے۔ ایک ایسے ٹریڈ سینٹر میں جہاں بہترین یونیورسٹیز کے بہترین دماغ اپنے اپنے آئیڈیاز کو رجسٹر کروانے کے بعد آن لائن موجود ٹریڈرز کے ساتھ اپنے آئیڈیاز کے حوالے سے بات چیت کرتے۔ وہ گروپ ڈسکشن بھی ہو سکتی تھی اور وہ ٹریڈرز کی آپس میں گفت و شنید بھی۔

پہلے مرحلے میں حمین پانچ بڑی کمپنیز کو اس بات پر آمادہ کر پایا تھا کہ وہ اس ٹریڈ روم میں آئیڈیا لے کر آنے والوں کے آئیڈیاز سنیں اور اس پر ان سے بات چیت کریں' اگر انہیں کسی کا آئیڈیا پسند آ جائے تو۔ اس کے عوض انہیں TAI کو ایک مخصوص فیس ادا کرنی تھی' اگر وہاں کوئی آئیڈیا انہیں پسند آ جاتا اور وہ اسے خریدنے کا

www.paksociety.com

میں سرمایہ کاری کرنے یا اس میں پارٹنرشپ کرنے پر تیار ہوتے تو۔ کیٹگری بی میں پیش ہونے والے آئیڈیاز کی خرید و فروخت بھی اسی فارمولا کے تحت ہوتی تھی' لیکن وہاں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ وہاں اپنے آئیڈیاز کے ساتھ آنے والے مختلف نوجوان افراد ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کے ذریعہ اپنی پسند کے کسی ایک جیسے آئیڈیا پر شراکت داری کرسکتے تھے اور اگر ایسا کوئی اشتراک کسی آئیڈیے کو عملی شکل میں ڈھال دیتا تو ٹریڈ این آئیڈیا اس اشتراک کے لیے بھی انہیں ایک فیس چارج کرتا۔

کیٹگری C اس سے بھی آسان تھی' وہاں کاروبار کے لیے آ[illegible] آئیڈیاز کو اوپر بھی کرسکتے تھے یعنی کسی بھی ٹریڈر کو اگر دوسرے کا آئیڈیا پسند آتا اور وہ اسے [illegible] تو پھر وہ اس آئیڈیے کے بدلے کچھ اور خدمات مہارت یا پروجیکٹ اسے پیش کرسکتا تھا۔ وہ ایک بنیادی سا فارمولا تھا جو حمین نے صرف زبانات کو کیش کرنے کی بنیاد پر نکالا تھا اور اپلائی کیا تھا۔

http://rspk.paksociety

پہلی بار اس کی کلائنٹ بننے والی پانچ میں سے تین کمپنیز کو وہاں پہلے مہینے میں تین ایسے آئیڈیاز پسند آگئے تھے جن کے فروخت کنندگان کو انہوں نے hire کرلیا تھا۔

تین سال پہلے کلائنٹس اور ٹریڈرز کی ایک محدود تعداد سے شروع ہونے والی کمپنی اب ان ابتدائی کاروبار سے بہت آگے بڑھ چکی تھی' وہ اب خود ٹریڈ این آئیڈیا پر آنے والے ٹریڈرز سے ایسے آئیڈیاز اور بزنس پروپوزلز لے لیتی جس میں انہیں دم خم نظر آتا اور وہ اپنے بڑے کلائنٹس کی ضروریات اور دلچسپی کے مطابق مختلف آئیڈیاز اور پروجیکٹس انہیں شیئر کردیتی۔

ٹریڈ این آئیڈیا نے پچھلے تین سال میں تین سو ایسی نئی کمپنیز کی بنیاد رکھی تھی جن کے آئیڈیاز ان کے پلیٹ فارم پر آنے کے بعد مختلف بین الاقوامی کمپنیز نے ان آئیڈیاز میں سرمایہ کاری کی تھی۔ ٹریڈ این آئیڈیا سے ملنے والے آئیڈیاز پر تکمیل پانے والے پروجیکٹس کی کامیابی کا تناسب نوے فی صد تھا۔

دنیا کے سو بہترین اداروں کے بہترین اسٹوڈنٹس کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والا یہ ادارہ اب دنیا کی ہزاروں یونیورسٹیز کے لاکھوں اسٹوڈنٹس کو اپنے اپنے آئیڈیاز گھر بیٹھے آن لائن نامور اور کامیاب ترین کمپنیز کے نمائندوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم نیا کاروبار شروع کرنے والوں کے لیے ایک ڈریم پلیٹ فارم تھا۔ ٹریڈ این آئیڈیا اب ان ہی کیٹگریز کے ساتھ ایک اور ایسی کیٹگری کا اضافہ کرچکا تھا جہاں کوئی بھی شخص اپنی خسارے میں جانے والی کمپنی' بزنس سیٹ اپ یا پروجیکٹ بیچ سکتا تھا اور آن لائن ہی اس کا تخمینہ بھی کروا سکتا تھا۔

حمین سکندر کا نام دنیا کی کسی بھی بڑی مالیاتی کمپنی کے لیے اب نیا نہیں تھا۔ اس کی کمپنی کاروبار کے نئے اصول لے کر آئی تھی اور ان نئے اصولوں پر کام کررہی تھی۔

"اکثر لوگوں کا خیال ہے میں رول ماڈل ہوں۔ ہوسکتا ہے میں بہت ساروں کے لیے ہوں۔۔۔ لیکن خود مجھے رول ماڈل کی تلاش کبھی نہیں رہی۔" تالیوں کا شور تھم جانے کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا تھا۔ "رول ماڈلز اور آئیڈیلز کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں اور میرے ماں باپ کو ہمیشہ مجھ سے یہ شکایت رہی کہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے اسٹوڈنٹس میں کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں اور اگلی ایک نشست پر بیٹھی امامہ بھی ہنس پڑی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں دلچسپی سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے اور وہ میرے باپ کی آٹوبائیوگرافی (سوانح عمری) تھی۔۔۔ وہ بھی بارہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے لیپ ٹاپ میں سے۔" سامنے والی نشستوں پر بیٹھی امامہ کا

www.paksociety.com

رنگ فق ہوگیا' وہ جیسے ایک دم بھول گئی تھی۔

"اور وہ واحد کتاب ہے' جس کو میں نے بار بار پڑھا۔ وہ واحد کتاب ہے جو میرے لیپ ٹاپ میں بھی ہے۔ میرے باپ کی آٹوبائیوگرافی کی بہترین بات یہ ہے کہ اس میں کوئی ہیرو نہیں کوئی آئیڈیل کوئی رول ماڈل نہیں ہے اور اسے پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ میرا باپ کتنا لکی ہے کہ اسے کسی سے متاثر ہو کر اس جیسا نہیں بننا پڑا' زندگی گزارنے کے ان کے اپنے اصول اور فارمولاز' ان کے بچپن اور جوانی گزارنے کے لیے رہنما رہے۔"

وہ کہتا جا رہا تھا اور وہاں بیٹھی امامہ عجیب سے شاک اور شرمندگی میں بیٹھی تھی' وہ کتاب جسے وہ آج بھی شائع کرانا نہیں چاہتی تھی' صرف اس لیے کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ان کے باپ کے حوالے سے کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ کتاب اس کی تیسری اولاد بارہ سال کی عمر میں صرف ایک بار نہیں' بار بار پڑھتا رہا تھا۔ اس کی ایک کاپی اس کے لیپ ٹاپ تک بھی چلی گئی تھی اور وہ بے خبر تھی۔

"میں نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ طے کیا تھا کہ مجھے متاثر ہونے جیسا آسان کام نہیں کرنا۔ متاثر کرنے جیسا مشکل کام کرکے دیکھنا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میرا تعارف کراتے وقت وہ ساری چیزیں گنوائی گئیں جن سے آپ سب کے سانس رک جائیں' آنکھیں جھپکنا بند ہو جائیں' منہ کھلے رہ جائیں۔۔۔ میں نے کس عمر میں کیا کر دیا اور کس عمر میں کیا۔۔۔ اس سال میری کمپنی کا ٹرن اوور کیا تھا۔۔۔ دنیا کے دس بہترین منتظم میں' میں کس نمبر پر ہوں۔۔۔ دنیا کی کون کون سی کمپنیاں میری کلائنٹ ہیں۔۔۔ آپ میں سے اگر کوئی مجھ سے اور میری کامیابی سے متاثر نہیں ہوا یہ سب سن کر بھی تو مجھے حیرت ہوگی۔۔۔" وہ رکا' جیسے مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "لیکن اس تعارف میں بہت سے ایسے حقائق شامل نہیں جن کو سن کر آپ کو مجھ میں اپنا آپ یا اپنے آپ میں' میں نظر آنے لگوں گا۔۔۔ جیسے اس تعارف میں یہ حقیقت شامل نہیں ہے کہ میں آج تک کوشش کے باوجود بھی اپنی بہن سے لیا گیا قرض واپس نہیں کر سکا۔"

مجمع میں ہلکی تالیوں کے ساتھ قہقہے گونجے۔

حمین بے حد سنجیدہ تھا۔

"لیکن میں ایک دن وہ ساری رقم واپس کروں گا۔۔۔ یہ وہ وعدہ ہے جو میں اس سے آٹھ سال کی عمر سے کر رہا ہوں' جب میں نے اس سے پہلی بار قرض لیا تھا اور میں' کبھی وعدہ پورا نہیں کر سکا۔" وہ ہنستے ہوئے مجمع کے سامنے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "میری بہن کے پاس ڈائریز کا ایک ڈھیر ہے' جس میں اس نے ادھار دیے جانے والے ایک ایک پینی کا بھی حساب رکھا ہوا ہے۔" تالیوں کے شور میں وہ رکا۔ "اور ہر اچھے بزنس مین کی طرح میں بھی اتنی بڑی رقم فوری طور پر کسی کو نہیں دے سکتا' چاہے وہ قرضے کی واپسی ہی کیوں نہ ہو۔" وہ بول رہا تھا۔

"اور میں سست ہوں' مغرور' جھوٹ بولتا ہوں' چیزیں اکثر بھول جاتا ہوں' دوستوں کو مایوس کرتا ہوں۔" اس کے ہر جملے پر وہ اسٹوڈنٹس پرجوش انداز میں تالیاں بجا رہے تھے جیسے کسی راک اسٹار کو داد دے رہے ہوں۔

"اور ان تمام خامیوں کے ساتھ بھی مجھے اگر بااثر ترین افراد کی فہرست میں رکھا جاتا ہے تو یہ خوف ناک بات ہے۔۔۔ خوف ناک اس لیے کیونکہ ہم ایک ایسے زمانے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں صرف کامیابی ہمیں قابل عزت اور قابل رشک بنا رہی ہے۔۔۔ ہماری انسانی خصوصیات اور خوبیاں نہیں۔"

تالیوں کے شور نے ایک بار پھر اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجمع اب اس کی حس مزاح کو نہیں اس کے ان الفاظ کو سراہ رہا تھا۔

"ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے یہ بات کہتے ہوئے میں احمق لگوں گا کہ ان چیزوں کا دوبارہ تعین

www.paksociety.com

کریں جو ہمارے لیے متاثر کن ہونا چاہئیں۔۔۔ میں دس سال کا تھا جب میرے باپ نے مجھے زبردستی پاکستان بھیج دیا۔۔۔ مجھے اور میری فیملی کو۔۔۔ کیونکہ میرے دادا کو الزائمر تھا اور میرے باپ کا خیال تھا انہیں ہماری ضرورت ہے۔۔۔ میں نے اگلے چھ سال اپنے دادا کے ساتھ گزارے۔۔۔ دنیا کی کوئی یونیورسٹی مجھے وہ تربیت اور علم نہیں دے سکتی جو الزائمر کے ہاتھوں اپنی یادداشت کھوتے ہوئے اس پچھتر سال کے بوڑھے نے اپنے دس سال کے پوتے کو دی۔۔۔ ایم آئی ٹی بھی نہیں۔۔۔"

ہنسانے کو تالیوں نے توڑا تھا پھر اس کے لیے کھڑے ہو جانے والے ہجوم نے اگلے کئی منٹ اپنے ہاتھ نہیں روکے۔

"میں ہمیشہ سوچتا تھا اس سب کا فائدہ کیا تھا۔۔۔ مجھے امریکہ میں ہونا چاہیے تھا' دادا کے پاس نہیں۔۔۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہو گیا۔۔۔ مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا' بات کرنا' سننا اور ان کی مدد کرنا اچھا لگنے لگا۔۔۔ دس سال کا بچہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انسان سامنے پڑی ہوئی چیز کا نام کیسے بھول سکتا ہے۔۔۔ لیکن میں یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس سب نے مجھے ایک چیز سکھائی۔۔۔ کل کبھی نہیں آتا۔۔۔ جو بھی ہے آج ہے۔۔۔ اور آج کا بہترین مصرف ہونا چاہیے۔۔۔ "کل" چانس ہے' ہو سکتا ہے "آپ کو نہ ملے۔"

اس نے تقریر ختم کر دی تھی' وہ پورا مجمع ایک بار پھر اس کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ تالیاں بجاتے ہوئے۔

امامہ بھی تالیاں بجا رہی تھی' ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے۔ اسے داد دیتے ہوئے۔ اس کی اولاد نے اسے ایسے بہت سے فخریہ لمحے دیے تھے۔ بہت سارے۔۔۔ آہستہ آہستہ اس گھر کے سارے پرندے اڑ گئے تھے۔۔۔ جبریل' عنایہ' حمین' رئیسہ۔۔۔ مگر ہر ایک کی پرواز شان دار تھی' وہ جس آسمان پر بھی اڑ رہے تھے فاتحانہ انداز میں اڑ رہے تھے۔

"تم سمجھ دار ہو گئے ہو یا ایکٹنگ کر رہے تھے؟" وہاں سے واپسی پر امامہ نے اس سے گاڑی میں پوچھا تھا۔

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہنس پڑا۔ "ایکٹنگ کر رہا تھا' یہ تو ظاہر ہے۔۔۔ غلط سوال کر لیا آپ نے مجھ سے۔"

اس نے ماں کی بات کے جواب میں کہا۔

"تم بہت خراب ہو حمین!" امامہ کو یک دم جیسے یاد آیا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا "آپ بابا کی آٹو بائیوگرافی بھول کیسے گئیں؟" حمین نے ماں کے اس جملے پر فوراً کہا۔

"تمہیں اسے نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔" امامہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"آپ ہی کہتی ہیں کتابیں پڑھنا اچھی عادت ہے۔" اس نے ماں سے کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کتابیں چوری کر کے اور بغیر اجازت پڑھو۔" امامہ نے اسی سنجیدگی سے اسے ڈانٹا۔

"زندگی میں پہلی اور آخری بار کوئی کتاب چوری کر کے پڑھی ہے۔ آپ تسلی رکھیں میں اتنا جنونی نہیں ہوں ریڈنگ کے بارے میں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

امامہ اگر اسے شرمندہ دیکھنا چاہتی تھی تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اس کے پاس ہر منطق اور ہر بہانہ تھا۔ سالار کا بیٹا تھا تو ان چیزوں کی بہتات تھی اس کے پاس۔

"ممی آپ خواہ مخواہ ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں' ہم بڑے ہو چکے ہیں' آپ ہر بات ہم سے راز میں نہیں رکھ سکتیں۔" اس نے ماں کا کندھا تھپکتے ہوئے جیسے اسے یاد دلایا۔

"باقی تینوں ہو چکے ہیں۔۔۔ تم نہیں ہوئے۔" امامہ نے اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتے ہوئے کہا۔

"دیٹس ناٹ فیئر' آپ نے میری تقریر نہیں سنی کیا؟" اس نے بے ساختہ اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا۔

www.paksociety.com

"وہ اسٹیج عنایہ نے لکھی ہوگی۔" امامہ نے کہا۔ ایک لمحہ کے لیے وہاں جواب ہوا اور ویڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بھی اسے امامہ کی چبھتی نظروں کا احساس ہو رہا تھا۔

"She just edited it" (اس نے صرف تصحیح کی تھی) اس نے بالآخر اعتراف کیا۔

"ایز آلویز" (ہمیشہ کی طرح) امامہ نے جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں.... میں ساری عمر اسپیچز لکھتا رہا ہوں' کرتا رہا ہوں' یہ مشکل نہیں ہے میرے لیے' میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

"کر سکتے ہو بالکل کر سکتے ہو' لیکن بس یہ نہ کہو کہ تمہاری تقریر سن کر تمہارے سمجھ دار ہونے کا یقین کر لوں۔" امامہ مزید کچھ کہنے کے بجائے خفگی کے عالم میں خاموش ہو گئی اور ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"غصے میں آپ بہت حسین لگتی ہیں۔" اس نے یک دم بڑی سنجیدگی سے کہا' امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ بھی میں نے بابا کی کتاب میں کہیں پڑھا تھا... چیپٹر نمبر فائیو میں.... ؟ نہیں شاید فورٹین۔" وہ اب اپنا بازو ماں کے کندھے کے گرد پھیلائے اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"واقعی لکھا ہے تمہارے بابا نے؟" امامہ نے جیسے بے یقینی سے اس سے پوچھا' اس کے باوجود کہ وہ یہ کتاب درجنوں بار پڑھ چکی تھی... ایڈیٹ بھی کر چکی تھی۔ اس کے باوجود ایک لمحہ کے لیے اسے واقعی شبہ ہوا۔

"لکھا تو نہیں لیکن اگر آپ کہیں تو میں ایڈیٹ کر کے شامل کر دیتا ہوں... آپ کو ویسے بھی پتا ہے میں غلط باتوں کا چیمپئن ہوں۔" اس نے بے حد اطمینان سے ماں سے کہا۔

وہ ہنس پڑی' وہ واقعی یہ بھی کر سکتا تھا۔ اس میں اسے شبہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہم کہیں مل سکتے ہیں؟" اسکرین چمکی۔

"کہاں؟" تحریر ابھری۔

"جہاں بھی تمہیں آسانی ہو' میں آجاؤں گا۔" جواب آیا۔

"اچھا سوچتی ہوں۔" لفظوں نے کہا۔

"کب تک بتاؤ گی؟" اشتیاق سے پوچھا گیا۔

"کچھ دنوں تک۔" تامل سے کہا گیا۔

"میں انتظار کروں گا۔" وعدے کی طرح دہرایا گیا۔

"جانتی ہوں۔" یقین دلایا گیا۔

اور پھر آگے کچھ بھی نہیں تھا... یوں جیسے کوئی پہاڑ آگیا ہو یا پھر کھائی کہ نہ لفظ رہے ہوں' نہ وقت۔

عنایہ نے اپنے فون پر انگلیوں سے سکرول کرتے ہوئے ان میسجز کے تھریڈ کو دیکھا' پڑھا' یوں جیسے پہلی بار اس گفتگو کو پڑھ رہی ہو۔ یوں جیسے وہ گفتگو پہلی بار ہوئی ہو۔ اس کی مخروطی خوب صورت دودھیا انگلیاں فون کی سکرین پر نہیں' جیسے ان لفظوں پر پھسل رہی تھیں۔

سوال جواب اتنے سالوں سے کرتے آرہے تھے وہ... اسی ترتیب میں... اور ہر بار گفتگو وہیں جا کر رکتی تھی جہاں اس بار ختم ہوئی تھی... اس سے آگے کے سوال و جواب دونوں کے پاس نہیں تھے یا شاید ہمت نہیں تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ پوچھتے... لیکن مہینے میں کم از کم ایک بار کسی بھی دوسرے موضوع پر بات کرتے کرتے ان

www.paksociety.com

کے درمیان اس گفتگو کا تبادلہ ضرور ہوتا۔۔۔ وہ سوال جواب کسی پرانی یادیا میوزک کی طرح بیک گراؤنڈ میں چلتے جیسے ابھی ہوا تھا۔۔۔ وہ کسی اور موضوع پر بات کر رہے تھے اور بات وہاں تک آگئی تھی۔۔۔ اور جہاں آگئی تھی وہاں رک گئی تھی۔۔۔ اب وہاں سے موضوع بدلنے کے لیے انہیں پھر کچھ وقت چاہیے تھا۔

وہ ایرک سے محبت نہیں کرتی تھی اور اسے شبہ تھا کہ شاید وہ بھی نہیں کرتا ہو۔۔۔ بہت سارے احساس وہم اور خوش فہمی بھی تو ہو سکتے تھے، مگر یہ بھی درست تھا کہ اتنے سالوں میں ایرک کے علاوہ اس کے سرکل میں کوئی مرد دوست نہیں تھا۔ امریکہ، پاکستان دونوں جگہ۔۔۔ اسکول، کالج۔۔۔ کسی بھی جگہ عنایہ کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنا سکی تھی، نہ وہ اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور نہ اسے ایسی کسی دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ایرک بھی ایسا ہی تھا اور یہ زیادہ حیرانی کی بات تھی۔ کیوں کہ وہ امریکہ میں رہتا تھا جہاں طرز زندگی بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود عنایہ کی طرح وہ بھی ریزروڈ تھا۔ اور جب وہ عنایہ سے کہتا تھا کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں تو عنایہ کو یقین ہوتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ اور اگر وہ یہ کہتا تھا کہ اگر اس کی پچھلے کئی سالوں سے کسی لڑکی کے ساتھ دوستی ہے بھی تو وہ عنایہ ہے تو اسے اس پر بھی یقین تھا۔

اور اس دوستی کے باوجود دونوں کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی، شاید اس کی وجہ فاصلہ تھا یا کلچر یا عنایہ کا وہ مزاج جس سے ایرک بخوبی واقف تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی تقریباً ہر روز ای میل، میسجز یا فون کے ذریعے ایک دوسرے سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔۔۔ کبھی بھی وہ صرف "میں اور تم" پر نہیں گئے تھے اور یہ دونوں کی طرف سے کی جانے والی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔

عنایہ ایک مہینہ پہلے رہائش کے لیے امریکہ آئی تھی اور چاہنے کے باوجود اس نے ایرک کو یہ نہیں بتایا تھا۔ بتانے کا فائدہ نہیں نقصان تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ خدشہ تھا کہ اس کے امریکہ آجانے پر وہ اس سے ملنے کی پوری کوشش کرے گا اور یہ اس کے لیے اس لیے بہت آسان ہوتا کیوں کہ وہ حمین اور جبریل کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ عنایہ ان دونوں سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اس کے امریکہ آنے کے بارے میں ایرک سے کچھ نہیں کہیں، ان دونوں نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ ایرک جیسے ان کی فیملی کے لیے ایک ایسی کھلی حقیقت تھا جس سے سب آنکھیں چرانا چاہتے تھے لیکن چرا نہیں پاتے۔ ایرک بہت عرصہ پہلے اس کے اور امامہ کے درمیان زیر بحث آچکا تھا۔ عنایہ جان چکی تھی وہاں اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس شادی میں کیا ایشوز تھے اور کیا خدشات، کیا اندیشے تھے اور کیا مسائل۔۔۔ عنایہ آنکھیں بند کر کے رٹے رٹائے انداز میں گنوا سکتی تھی کیوں کہ اس نے یہ سب کچھ امامہ سے لاتعداد بار سنا تھا اور اس نے امامہ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ ایرک سے دور جانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود کہ امامہ نے اسے کبھی ایرک سے قطع تعلق کرنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن عنایہ کا خیال تھا اسے یہ "عادت" بدل دینی چاہیے، جو دونوں کے لیے ایک اسٹیج پر آکر آزار بن سکتی تھی۔

وہ دونوں زیادہ تر ای میلز اور ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ رابطے میں رہے تھے۔ عنایہ نے کوشش کی تھی یہ رابطہ کم ہونا چاہیے۔ تعلیمی مصروفیات، پروفیشنل ذمہ داریاں، اس کے پاس بہترین بہانوں کے طور پر موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود ایرک سے اس کا رابطہ ٹوٹ نہیں سکا اور یہ کمال ایرک کا تھا، وہ جڑا رہا تھا، اس کی بے اعتنائی، بے رخی، سرد مہری کے باوجود۔۔۔ یہاں تک کہ عنایہ کو شدید قسم کی ندامت ہونے لگی تھی۔۔۔ پتا نہیں اس شخص میں اتنی برداشت اور تحمل کیسے تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے اور کم اہمیت پانے پر بھی کوئی اعتراض، کوئی احتجاج نہیں کرتا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اسے بیٹھے بٹھائے کاموں کا ڈھیر اب ہی کیوں یاد آنے لگا تھا اور

www.paksociety.com

نہ ہی یہ کہ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا' اس سے زیادہ مصروف تھا تو کم از کم وہ پروفیشنل مصروفیات کا بہانہ اس کے سامنے پیش نہ کرے۔

وہ ہفتوں اس کی کسی ای میل' کسی میسج کا جواب دیے بغیر غائب رہتی اور وہ پھر بھی اس کو ٹیکسٹ میسجز کے ذریعے اپنا حال احوال' اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہتا اور پھر وہ کئی دنوں بعد اس کے بھیجے ہوئے کسی نہ کسی ٹیکسٹ' کسی نہ کسی ای میل کا جواب دینے پر مجبور ہو جاتی اور وہ اپنی غیر حاضری کا جو بھی بہانا بناتی' وہ بغیر بحث کے قبول کر لیتا' چاہے وہ کتنا ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہوتا اور اس کی یہ قبولیت جیسے اس کے احساس جرم کو اور بڑھا دیتی۔ وہ بچپن میں ایسا نہیں تھا جیسا بڑا ہو کر ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں میں عنایہ میں اتنی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں جتنی ایرک میں آئی تھیں اور اس کی بہت سی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک بنیادی وجہ اس کا قبول اسلام بھی تھا۔

وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایرک سے عبداللہ ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی اپنے سوشل سرکل میں ایرک کہلاتا تھا یا پھر ایرک عبداللہ... ان لوگوں کے امریکہ سے آجانے کے بعد بھی ایرک ان سے رابطے میں رہا تھا' وہ اسے بھی ای میل کرتا تھا اور امامہ کو بھی اور اس کی ہر ای میل امامہ کو جیسے ایک یاددہانی کی طرح لگتی تھی' حالانکہ اس کی ای میلز میں رسمی گفتگو کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ بھی میڈیسن میں ہی ریذیڈنسی کر رہا تھا... عنایہ کی طرح۔ ان کے پروفیشن نے دو مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بھی ان دونوں کو بڑے عجیب انداز میں ایک دوسرے سے باندھے رکھا تھا... اس نے لنگ ایڈورڈ سے پڑھا تھا اس نے ایرو زوناسے... اسے آئی سرجن بننا تھا ایرک کو ہارٹ... مگر ان کے مشترکہ پروفیشن نے جیسے ان کو گفتگو کے لیے بہت سارے موضوعات دے دیے تھے۔

قبول اسلام کے بعد یونیورسٹی میں گریجویشن کے دوران وہ چند سال تک گرمیوں میں پاکستان آتا رہا تھا لیکن ایک بار میڈیکل میں جانے کے بعد وہ آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ امامہ اس بات پر خوش ہوئی تھی' وہ کبھی بھی اسے پاکستان آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ سالار سمیت فیملی کے کسی بھی شخص کو ایرک کے پاکستان آنے پر اعتراض نہیں تھا اور وہ اسے منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن اس طرح اس کا ہر سال ان کے پاس آنا امامہ کے خدشات بڑھاتا رہا تھا اور جس سال پہلی بار اس نے پاکستان نہ آنے کے بارے میں انہیں اطلاع دی تھی' امامہ نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اب اپنی زندگی کی نئی مصروفیات میں سب کچھ بھول جانے والا تھا۔

کچھ ایسا ہی عنایہ نے بھی سوچا تھا۔ اسے بھی لگا تھا ایرک بدل جائے گا' اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ میڈیکل کی تعلیم مشکل تھی پھر اب اس کی زندگی میں اور لوگ آ رہے تھے۔ وہ ان کے خاندان کو اور اسے اگر بھول بھی جاتا تو اس کے لیے نارمل ہوتا... ہلکی کسک اور گلے کے باوجود... لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاکستان آنا جانا چھوڑا تھا' ان سے رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔ اور اس تعلق اور رابطے کے باوجود ان دونوں کے درمیان اعتراف یا اظہار کا کوئی کمزور لمحہ نہیں آیا تھا۔ اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اس کے لیے اسپیشل تھی لیکن یہ جملہ اس نے کبھی اس کی زبان سے نہیں سنا تھا اور یہ شاید بہت اچھا ہی تھا۔ تعلق ختم کرتے ہوئے گلے اور شکایتیں کچھ کم رہتیں... تکلیف بھی... یہ عنایہ سکندر کا خیال تھا۔

اس کے لیے اب رشتے دیکھے جا رہے تھے۔ ہم پلہ لوگوں کو منتخب کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے اندازہ تھا اس کی ریذیڈنسی کے دوران ہی اس کی منگنی یا شاید شادی ہو جائے گی اور وہ اس کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے ان فیملیز اور لڑکوں سے بھی مل رہی تھی جن سے اس کا رشتہ طے پانے کا امکان تھا اور اس

www.paksociety.com

سب کچھ کے درمیان اریک عبداللہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ نہ وہ زندگی سے جاتا تھا نہ دل سے نہ دماغ سے۔

اس دن بھی ان دونوں کے درمیان ایک چیٹنگ ایپ پر معمول کے میسجز کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاسپٹل کا کوئی مسئلہ بتا رہا تھا اور اس نے جواباً" بڑی روانی سے اسے اپنے ہاسپٹل کا نام بتاتے ہوئے وہاں کسی مسئلے کا ذکر کیا اور سینڈ کا بٹن دباتے ہوئے بے اختیار اپنی غلطی پر پچھتائی۔ اس کا ٹیکسٹ اب فون کی اسکرین پر نمودار ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا اریک عبداللہ اتنا کند ذہن نہیں تھا کہ وہ اس جملے کو نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ اس کے جملے کے بعد بہت دیر تک دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یوں جیسے وہاں سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ پھر بالآخر وہ ٹیکسٹ آیا جس کی اسے توقع تھی۔

"تم امریکہ میں ہو؟"

اس کا دل چاہا وہ لکھ دے اسمارٹ فون نے اسپتال کا نام غلطی سے لکھ دیا تھا۔ یا کوئی اور جھوٹ یا بہانا۔ وہ تو مان لیتا تھا۔ سوال جواب اور بحث کب کرتا تھا لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی بس دل چاہا تھا اسے "ہاں" کہہ دے اور اس نے یہی کیا تھا۔

اس سکے لیں نے اریک عبداللہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ عنایہ کا خیال تھا۔ فون ہاتھ میں پکڑے اس کی اسکرین پر نظریں جمائے وہ اس "ہاں" کے بعد کسی رد عمل کا انتظار کرتی رہی۔ خوشی، حیرت، بے یقینی، غصہ۔ کسی بھی رد عمل کا۔ وہ آن لائن تھا اور وہاں سکوت تھا۔ ایسا سکتہ اور سکوت کہ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو ڈر لگا۔ اس نے ہیلو لکھ کر اسے جیسے اس سکتے سے جھنجوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں؟" دوسری طرف سے اس کی تحریر ابھری تھی۔ اس بار خاموشی عنایہ کی طرف چھائی تھی۔ وہ ایک سو ایک بہانے بنا سکتی تھی لیکن ایک بھی بہانا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان شاید اب وہ لمحہ آگیا تھا جب اسے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

"تم مجھ سے ملنے کے لیے کہتے اور میں ملنا نہیں چاہتی تھی اس لیے۔" دوسری طرف بہت لمبی خاموشی چھائی تھی اس بار اتنی ہی لمبی جتنا عنایہ توقع کر رہی تھی۔

"آل رائٹ" پھر اسکرین چمکی اور بجھ گئی۔

وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ بحث کرتا ہی نہیں تھا، غصہ دکھاتا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اسی طرح اختصار والے انداز میں بات کیا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو غصہ آیا کہ وہ خوامخواہ احساس ندامت لے کے بیٹھی تھی۔ اچھا ہے صاف صاف کہہ دیا اور نہ ملنے سے اسے فرق کیا پڑتا تھا، وہ ویسے بھی دو مختلف ریاستوں میں تھے۔ ملنے کے لیے بھی انہیں چھٹیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ سوچ رہی تھی ساتھ ہی اپنے آپ کو توجیہات بھی دے رہی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد ابھرنے والے اگلے ٹیکسٹ نے اسے چونکایا۔

"کب؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"17 کو" جواب آیا۔

"کیوں؟" اس نے اب وہ پوچھا جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

جواب نہیں آیا اور کئی دنوں تک نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

ہشام نے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا مگ خالی کیا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر اشاروں کی زبان میں اپنے سامنے

www.paksociety.com

بیٹھی عورتوں اور بچوں سے مخاطب ہو کر انہیں صحت و صفائی کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے اپنے بیگ سے اس سے متعلقہ چیزیں نکال کر دے رہی تھی۔۔۔ صابن۔۔۔ ٹوتھ پیسٹ۔۔۔ ٹوتھ برش' ٹوتھ پک' منشیل کنزرویٹی کے بنڈل' ٹشو' فرسٹ ایڈ کٹ اور اس میں موجود سامان۔۔۔ وہ سب عام استعمال کی چیزیں تھیں جنہیں کسی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک میں بھی بیٹھ کر کسی کو ان کا استعمال سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔۔۔ لیکن وہ دادا ب تھا' کینیا کے بارڈر کے قریب UNHCR کے افریقہ میں بڑے ترین کیمپوں میں سے ایک۔۔۔ جہاں افریقہ میں قحط اور خانہ جنگی سے متاثرہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔

اور ان دونوں کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔۔۔ دادا ب میں یہ ان کا پہلا وزٹ تھا' لیکن وہ پچھلے چار سالوں میں UNHCR کے بہت سارے کیمپس میں جا چکے تھے۔ افریقہ' ایشیا' لاطینی امریکہ۔۔۔ یہ ان کی تفریح بھی تھی جنون بھی اور کام بھی۔

لکڑی کی ایک خالی پیٹی کو الٹا کر بیٹھے ویسی ہی ایک دوسری پیٹی کو میز بنائے اور اس پر چائے کے مگ رکھے' اپنی چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ شدید تھکن کے عالم میں بھی اسے دیکھتا رہا۔۔۔ وہ مختلف جگہوں پر سے آنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ اس دن صبح سے ہونے والا ان کا اٹھائیسواں کیمپ تھا۔۔۔ وہ گروپ کی شکل میں نکلے تھے اور اب وہ دو دو کی ٹولیوں میں' لگے نئے خیموں میں جا جا کر اندراج کرتے ہوئے صحت و صفائی کے حوالے سے سامان تقسیم کرتے پھر رہے تھے اور اب شام ہونے والی تھی۔۔۔ ہشام نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔۔۔ گرم پانی کے فلاسک اور پشت پر لدے بیگ سے مگ اور چائے کا سامان نکال کر وہ اپنی ساتھی کے واپس آنے سے پہلے ہی چائے بنا کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ابھی بھی وہیں تھی۔۔۔ اسی طرح اپنے کام میں محو۔۔۔ اس نے اپنا مگ دوبارہ چائے سے بھرا۔

وہ اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے ملکوں میں جا چکا تھا اور لوگ کوئی بھی ہوں' زبان کوئی بھی ہو اس نے اپنی ساتھی کو کبھی کسی دقت کا شکار نہیں دیکھا تھا۔۔۔ وہ اشاروں کی زبان کی ماہر تھی لیکن ہشام جانتا تھا وہ اشاروں کے بغیر بھی کسی کو تکنے سے اس کے دل کا حال اگلوا لیتی۔۔۔ ایک عجیب گرم جوشی تھی اس میں جو کسی کا بھی دل موم کر کے رکھ دیتی اور وہ اب یہی کر رہی تھی۔

ان گندے' کمزور' بیمار' قحط زدہ تباہ حال لوگوں کے بیچ بیٹھی وہ پروفیشنل مہارت سے اپنا کام کرتے ہوئے اشاروں کی زبان اور ٹوٹی ہوئی مقامی زبان میں ان سے گپ شپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ' عورتوں کے ساتھ مسکراہٹوں اور معانقوں کا تبادلہ۔۔۔ وہ اپنا کام ختم کرنے کے قریب تھی۔۔۔ اس کے پاس موجود سامان ختم ہو چکا تھا اور اس سامان سے خالی ہونے والا بیگ اس نے ایک پانچ سالہ بچے کو اوڑھانے والے انداز میں دیا تھا' جو بار بار اس بیگ کو لینے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور پھر ہشام نے ایک چھوٹی بچی کو اس کے بالوں میں لگی ہوئی ایک خوب صورت ہیئر پن کو چھوتے دیکھا۔۔۔ وہ زمین پر پڑے ایک لکڑی کے کریٹ پر بیٹھی تھی اور وہ بچی اس کے عقب میں جا کر اس کے تقریباً" جوڑے والے انداز میں لپیٹے ہوئے بالوں کو چھیڑ رہی تھی اور پھر اس نے اس ہیئر پن کو اتارنے کی کوشش کی' ہشام نے اسے پلٹ کر اس بچی کو اٹھا کر اپنی گود میں لیتے دیکھا اور پھر اپنے بالوں میں لگی ہوئی ہیئر پن اتار کر اس نے اس بچی کے گھونگھریالے بالوں میں لگا دی اور اسے گود سے اتارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بالآخر ہشام کی طرف متوجہ ہوئی جو تب تک چائے کا دوسرا مگ بھی ختم کرنے کے قریب تھا۔ انہیں وہاں سے ابھی کافی دور چل کر جانا تھا' جہاں سے انہیں UNHCR کی گاڑی مل جاتی جو انہیں اس جگہ لے جاتی جہاں پر ان تمام ورکرز کی رہائش تھی۔

ہشام نے اسے بالآخر اپنی طرف آتے دیکھا' وہ دور سے مسکرائی۔ ہشام نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب

www.paksociety.com

مسکراہٹ سے دیا۔

"تم ہر کام بہت جلدی کر لیتے ہو۔" اس کے قریب آکر لکڑی کے ایک اوندھے ہوئے کریٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جیسے ہشام کو سراہا۔ وہ واقعی اپنے ذمہ لگائے ہوئے تمام کام بہت تیزی سے کرنے کا عادی تھا۔

"عقل مند ہوں اس لیے۔" اس نے جواباً مسکراتے ہوئے چائے کا وہ مگ اس کی طرف بڑھایا جس میں پڑی چائے کے ٹھنڈا ہونے پر اس نے اسے پھینک کر اس کے لیے ابھی دوبارہ چائے بنائی تھی۔

"مجھ سے بھی زیادہ۔" اس کی ساتھی نے چائے کا مگ ہشام سے لیتے ہوئے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"تم سے تو واقعی زیادہ۔" اس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

شام اب آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی' پناہ گزینوں کا وہ ہجوم اب آہستہ آہستہ وہاں سے دور اپنے خیموں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے آج انہیں جو کچھ ملنا تھا مل چکا تھا۔

ایک کچی پگڈنڈی نما سڑک کے کنارے سبزے میں لکڑی کے کریٹ الٹائے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ دونوں اپنی ٹانگیں سیدھی کیے جیسے اپنی تھکن اتار رہے تھے۔

"تمہارے لیے کچھ ہے۔" ہشام نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر مگ رکھتے ہوئے جیب سے کچھ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رئیسہ نے اس انگوٹھی کو بے حد تعجب کے عالم میں دیکھا تھا جو ہشام نے اس کے سامنے بڑھائی تھی۔ ایک بے حد خوب صورت سبز زمردی ڈبے میں دھری آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایک ہیرے کی انگوٹھی۔ اس نے سر اٹھا کر ہشام کو دیکھا' وہ کچھ دیر کے لیے جیسے چائے پینا بھول گئی جو وہ مگ میں ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

"یہ کہاں سے ملی؟" دارآب کے اس ویرانے میں اس انگوٹھی کو دیکھ کر جو خیال کسی کو آنا چاہیے تھا وہی رئیسہ کو بھی آیا تھا۔

"کیا مطلب کہاں سے ملی؟" ہشام بری طرح بدکا "میں نے خریدی ہے۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"نیروبی سے" ہشام نے جواباً کہا۔

"پھر مجھے کیوں دے رہے ہو؟" اس نے چائے پینا دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ سوال کرنے کے باوجود وہ نروس ہوئی تھی' اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔" ہشام نے ایک بار پھر اس انگوٹھی کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

رئیسہ نے ایک نظر اسے دیکھا' ایک نظر اس انگوٹھی کو اور پھر گردن گھما کر اس پورے علاقے کو۔ وہ خاردار جھاڑیوں اور پناہ گزینوں کے خیموں بیچ اسے ایک ڈائمنڈ رنگ پیش کرتے ہوئے پروپوز کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکی کے لیے ایک رومانٹک لمحہ تھا' اور اس کے لیے بھی ہوتا' اگر اسے یک دم ہنسی آنا شروع نہ ہو گئی ہوتی۔ چائے کا مگ لکڑی کے ایک کریٹ پر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے بے حال ہونے لگی تھی۔

ہشام بری طرح نادم ہوا اور اس نے ڈبیہ بند کر دی۔

"یہ اس طرح ہنسنے کا کیا مطلب ہوا؟" اس نے رئیسہ سے پوچھا' وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکی تھی۔

"ہم یہاں ریلیف کے کام کے لیے آئے ہیں۔" اس نے ہشام کو یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا "تم کچھ اور کیسے سوچ سکتے ہو؟"

www.paksociety.com

"وہ کیوں نہیں سوچ سکتا؟" ہشام نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں بیٹھے سوچ رہا ہوں اور بس میرا دل چاہا' میں تمہیں پروپوز کردوں تو کر دیا۔"

رئیسہ نے چائے کا مگ دوبارہ منہ سے لگا لیا' وہ اب سنجیدہ تھی۔ ہشام ڈبیہ ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"تم کچھ نہیں کہو گی؟"

"میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی (فوری طور پر)۔" اس نے بالآخر چائے کا مگ رکھ دیا۔ وہ اب اپنے بیگ کو کھول کر ایک ریڈیو نکال رہی تھی' یہ جیسے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش تھی۔

"کیوں...؟ تم پسند نہیں کرتیں مجھے؟" ہشام بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں کوئی بھی ناپسند نہیں کر سکتا' لیکن شادی کا فیصلہ بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے... میں خود نہیں کرتی ہوں... تمہیں میری فیملی کی رضامندی مجھے پروپوز کرنے سے پہلے لینی ہو گی۔" ریڈیو فریکوئنسی سیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ہشام کی طرف دیکھے بغیر اس سے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ہشام نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ "میں ان سے بات کرلوں گا' یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔" رئیسہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ اس کی قومیت اس کی فیملی کے لیے قابل اعتراض ہو سکتی تھی' وہ امریکہ اور عنایہ کے معاملے میں امامہ کی رائے سے بہت اچھی طرح واقف تھی... وہ اپنے تمام بچوں کی شادیاں پاکستانیوں سے کرنا چاہتی تھی۔

"تم یہ رنگ اپنے پاس رکھ لو میں تمہاری فیملی سے بات کرلوں' تب تم اسے پہن سکتی ہو۔" ہشام نے وہ ڈبیہ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھائی۔ رئیسہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھایا' وہ اپنے گھٹنے پر رکھے ریڈیو کے ساتھ مصروف تھی یا کم از کم یہی ظاہر کر رہی تھی۔

"اس کا فائدہ نہیں... اگر میں نے رنگ لے لی اور میری فیملی نے انکار کر دیا تو؟" اس نے ہلکی آواز میں خبریں سنتے ہوئے کہا۔ ہشام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تمہاری فیملی انکار کیسے کر سکتی ہے؟" وہ پہلی بار کچھ بے چین ہوا تھا۔

"ہمیں ہر پوسیبلٹی سامنے رکھنی چاہیے۔" رئیسہ نے مدھم آواز میں جیسے اسے سمجھایا۔

"وہ انکار کر دیں گے تو؟" ہشام نے پوچھا۔

"تو بس۔" رئیسہ نے کہا۔

"یعنی بس ختم؟" ہشام کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"تم یہ کیسے ہونے دو گی... میرے لیے تمہاری کوئی فیلنگز نہیں ہیں؟" ہشام کو جیسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"فیلنگز ہیں تمہارے لیے لیکن وہ میری اپنی فیملی کے لیے فیلنگز سے بہت کم ہیں... کم از کم ابھی' کیا تم اپنی فیملی کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتے ہو؟" رئیسہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں میں کر سکتا ہوں۔ کم از کم تم سے شادی تو..." اس نے جواباً کہا تھا۔ رئیسہ کو جیسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ریڈیو کو چھیڑتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"ویسے یہ جو رنگ میں ڈائمنڈ ہے' یہ نقلی ہے۔" ہشام بری طرح چونکا۔ وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔

اس نے بے اختیار ہاتھ میں پکڑی ڈبیہ کھولی اور اس میں سے انگوٹھی نکال کر اسے آنکھوں کے پاس لے

www.paksociety.com

جاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ میری ممی کے پاس بہت سارے ڈائمنڈز ہیں' میں ڈائمنڈ پہچان سکتی ہوں۔" رئیسہ نے اسی انداز میں کہا۔

وہ ویک اینڈ پر نیوول گئے تھے اور جیولری کی مارکیٹ میں پھرتے ہوئے ایک دکان پر رئیسہ کو یہ انگوٹھی اچھی لگی تھی۔ جو ہشام نے اسے بتائے بغیر خرید لی تھی' وہ اسے اسی انگوٹھی کے ساتھ پرپوز کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم نے مجھے تب کیوں نہیں بتایا؟ میں نے تو ڈائمنڈ کی رنگ کے طور پر بہت مہنگا خریدا ہے اسے۔" ہشام حیران سے زیادہ شرمندہ ہوا۔

"مجھے یہ تھوڑی پتا تھا کہ تم اسے خریدنا چاہتے ہو۔ مجھے تو بس اچھی لگی تھی اور جیولر کہہ رہا تھا ڈائمنڈ ہے تو میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی یہ بتا کر کہ یہ ڈائمنڈ نہیں ہے۔" رئیسہ نے اس سے کہا۔

ہشام نے کچھ مایوسی کے عالم میں اس رنگ کو ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ بند کردی۔ رئیسہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور ہاتھ بڑھا کر تسلی دینے والے انداز میں اس سے وہ ڈبیہ لی۔

"تمہارا بڑا نقصان ہوگیا۔" اس نے جیسے ہشام کو تسلی دی۔

"نہیں' اتنا نقصان نہیں ہوا جتنی شرمندگی ہوئی ہے کہ میں ایک نقلی ڈائمنڈ کے ساتھ تمہیں پرپوز کررہا تھا۔"

رئیسہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "پریشان مت ہو' میں اسے رکھ لیتی ہوں۔ اگر میری فیملی مان گئی تو میں یہی رنگ پہن لوں گی۔" وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

وہ انگوٹھی کو وہ محبت میں لینے پر تیار نہیں تھی' ہمدردی میں لے رہی تھی۔ وہ واقعی فلاحی کارکن تھی۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"خوش ہوں اس لیے۔" ہشام نے جواباً کہا۔

"مجھے پتھروں میں ڈائمنڈ کی پہچان ہو نہ ہو' انسانوں میں ہے۔ اور میں نے ایک نقلی ڈائمنڈ ایک اصلی ڈائمنڈ کو دیا تھا' کم از کم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" ہشام نے اتنے سال کے ساتھ میں اسے پہلی بار شرم سے سرخ ہوتے دیکھا۔

وہاں اب خاموشی تھی۔۔۔۔ ہوا کی سرسراہٹ۔۔۔ اترتی شام اور اس میں ریڈیو پر چلنے والا نیوز بلیٹن جس میں بحرین میں ایک طیارے کے کریش ہونے کی خبر دی جارہی تھی' جس پر وہ دونوں اکٹھے متوجہ ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

شائع ہوگئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو — راحت جبیں — قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں — فائزہ افتخار — قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں — لبنیٰ جدون — قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

www.paksociety.com

☼ ☼ ☼

آج بہت لمبے عرصے کے بعد امامہ اس کمرے میں اس باکس کو کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کرکے وہ سارے اسکیچ بکس اور اسکریپ بکس نکالے جس پر کئی دہائیوں پہلے اس نے اپنے گھر کی بنیادیں پنسل اور رنگوں سے رکھنی شروع کی تھیں۔

وہ اس کمرے کی صفائی کروانے کے لیے ملازم کے ساتھ وہاں آئی تھی اور صفائی کراتے ہوئے اس باکس کو دیکھتے ہی اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا اور اب صفائی مکمل کرانے کے بعد وہ اس باکس کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ بڑی فرصت سے پرانی یادوں کو گنگنانے اور جینے کے لیے۔

وہ ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح انہیں کھولے کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد وہ اسکریپ بکس خستہ حال ہو رہی تھیں۔ اسکیچز میں بھرے ہوئے رنگ اڑنے لگے تھے، لکھے ہوئے لفظ مٹنے لگے تھے، کھنچی ہوئی لکیریں دھندلانے لگی تھیں... لیکن ان دھندلی لکیروں، مٹتے لفظوں، پھیکے پڑتے رنگوں اور بھربھراتے کاغذوں میں بھی اسے ہر یاد ویسی ہی رنگین، تازہ، خوش گوار، زندہ محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ آج ہی کا قصہ تھا... کل ہی کی بات تھی، پرسوں ہونے والا واقعہ تھا۔

وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ ہر صفحہ بڑی احتیاط سے پلٹ رہی تھی یوں جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی تو رنگ جھڑ جائیں گے، لکیریں رگڑ کھا کر چھومنتر کی طرح غائب ہو جائیں گی، سب کچھ غائب ہو جائے گا، اپنے ساتھ اس کی زندگی کے بہترین دنوں کو لے کر۔

ہر صفحے پر اس کے ہاتھ کے بنے اسکیچز تھے... کون سا کمرہ کیسے بننا تھا... کس دیوار پر کیا لگنا تھا... کہاں کیسا رنگ ہونا تھا... اس کے ہاتھ کی تحریر میں وہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں... ہر صفحہ، ہر لکیر، ہر تصویر یک دم جیسے بولنے لگی تھی۔ اس کے اور سالار کے درمیان ہونے والی باتیں... وہ ہر چیز بنا کر سالار کو دکھاتی تھی، اس سے رائے لیتی تھی، جب بھی جہاں بھی کسی کے گھر اسے کوئی چیز پسند آجاتی، وہ چیز اس کی اسکریپ بک میں موجود اس کے گھر کے کسی کمرے کا حصہ بن جاتی تھی۔ ان صفحات پر بنی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں اپنی اور سالار کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

پتا نہیں زندگی اتنی تیزی سے کیوں گزرتی ہے یا پھر بالکل رک کیوں جاتی ہے۔ جب وہ سالار کے ساتھ تھی تو سب کچھ ہوا کی رفتار سے گزر جاتا تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ تو سب کچھ ایسے رک گیا تھا جیسے زندگی کو زنگ ہی لگ گیا ہو۔

اس نے ایک صفحہ اور پلٹا... پھر ایک اور... اس اسکیچ بک میں موجود گھر بناتے ہوئے اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندگی میں صرف یہی ایک گھر بنا سکتی ہے، وہ بھی کاغذ پر... حقیقت میں نہیں، وہ محنت اور وقت جو اس نے اس گھر پر لگایا تھا، شاید اتنی ہی مدت تھی جتنی کوئی اپنے گھر پر لگاتا تھا لیکن اس کا گھر اس مدت کے بعد بھی کاغذوں پر ہی رہا تھا، کبھی زمین پر حقیقت بن کر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

اس کی زندگی کی بہت ساری خواہشات میں صرف ایک وہ ایسی خواہش تھی جو حسرت بنی تھی اور اب تو ایک مدت ہو گئی تھی اس نے "گھر" کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا... آج بس اس باکس کو دیکھنے پر اسے یاد آیا تھا کہ اس نے بھی ایک گھر بنانے کی کتنی خواہش کی تھی... بچت بھی کی تھی... کوشش بھی... لیکن بعض چیزیں مقدر میں نہیں ہوتیں۔ ان صفحوں پر پھیلی خوابوں کے گھر کی وہ تصویریں اس کی زندگی کے سب سے اچھے دنوں کی تصویریں تھیں۔ ان کے در و دیوار سے اس کی خوشیاں اب بھی چھلکتی تھیں... اتنے سالوں کے بعد بھی...

www.paksociety.com

وہ گھر حقیقت میں ٹنڈ ڈھلنے کے باوجود اسے عجیب خوشی دے رہا تھا۔ عجیب طرح سے گدگدا رہا تھا۔ جیسے کوئی ننھا بچہ اپنا دل پسند کھلونا پالینے پر کھلکھلاتا ہے۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ان اسکیچ بکس کو بند کیا لیکن پھر باکس میں رکھنے کے بجائے وہیں سامنے پڑی میز پر رکھ دیا۔

اسے امریکہ سے آنے والے اس مہمان کے استقبال کی تیاری کرنی تھی جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جبریل سکندر کی ڈاکٹر ویزل برنارڈ کے ساتھ آخری سرجری تھی۔ وہ اس کے بعد ریٹائر ہو رہے تھے اور ان کے اسسٹنٹ کے طور پر وہ آخری سرجری اس کی زندگی کی سب سے اہم سرجری تھی۔

وہ پانچ سالہ ایک بچہ تھا جو سیڑھیوں سے گر کر سر پر لگنے والی ایک چوٹ کے بعد کوما میں گیا تھا۔ اور اب اسے سرجری کی ایمرجنسی میں ضرورت پڑی تھی۔ اس کے دماغ میں انٹرنل بلیڈنگ ہو رہی تھی۔

جبریل ڈاکٹر ویزل کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے کام کر رہا تھا۔ وہ امریکہ کی تاریخ کے کامیاب ترین سرجنز میں سے ایک تھے اور جبریل ان کا پسندیدہ ترین اسسٹنٹ تھا۔ ڈاکٹرز کے سرکل میں ڈاکٹر ویزل برنارڈ کو دیوتا کی حیثیت حاصل تھی' وہ یہودی النسل تھے اور ان کے ساتھ کام کرنا ہی خود ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ وہ مزاجا" بے حد اکھڑ اور تیکھے مزاج کے تھے اور بے حد کم کسی کے کام سے خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ خاص طور پر کسی مسلمان کے اور وہ بھی ایشیائی نسل کے۔

اس کے باوجود جبریل سکندر ان کا چہیتا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ اس میں اپنا آپ دیکھتے تھے اس کی یکسوئی اس کی مہارت کو۔ اور یہ بات اس ہاسپٹل میں سب کو پتا تھی کہ ڈاکٹر ویزل کو ٹھنڈا رکھنے کا کام جبریل سکندر سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔

اور جتنے مہربان وہ جبریل کے ساتھ تھے اتنا ہی متاثر وہ ڈاکٹر ویزل سے تھا۔ نیورو سرجن کے طور پر ان کا ٹریک اگر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو

نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں

میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی

فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم

تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

www.paksociety.com

دنیا میں بچا تھا تو وہ اس قابل تھے۔ اپنی بد مزاجی کے باوجود۔ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی۔ وہ کتے اور دو بلیاں پالی تھیں اور ساری زندگی ان ہی کے ساتھ گزاری تھی اور انہوں نے جبریل کو بھی اپنی پہلی ملاقات میں پہلا مشورہ یہی دیا تھا۔

"تم اس فیلڈ میں بہت آگے جا سکتے ہو' اس لیے شادی مت کرنا۔ اپنے پروفیشن اور کیریئر کو فوکس کرنا۔ دنیا کا ہر شخص اپنی زندگی اچھی کرنے کے لیے شادی کر سکتا ہے' لیکن دنیا کا ہر شخص دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی قربان نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے جبریل کو نصیحت کی تھی جو اس نے مسکرا کر سنی تھی اور اب اتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر ویزل کے مزاج کو بخوبی سمجھ اور پڑھ سکتا تھا۔

"تمہارا ہاتھ مسیحا کا ہاتھ ہے' کیونکہ تم اچھے ماں' باپ کا خون رگوں میں لیے ہوئے ہو اور قرآن کے حافظ ہو۔۔۔ اپنی اس مسیحائی کی حفاظت کرنا۔"

انہوں نے چند دن پہلے اس کے اپارٹمنٹ پر اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا تھا جو اس کی طرف سے ان کے لیے ایک الوداعی ڈنر تھا۔ وہ ان کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے حد متعصب اور کٹر قسم کے یہودی تھے' ان کی زبان سے قرآن حفظ کرنے کو مسیحائی سے جوڑنا جبریل کے لیے ناقابل یقین تھا اور اس کے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی نے جیسے اس کے تعجب کو ان تک بھی پہنچایا تھا۔

"برے مسلمان برے لگتے ہیں' اچھے نہیں۔" وہ کہہ کر اپنی ہی بات پر خود ہنسے تھے۔

"آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔" جبریل نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں نہ بھی ہوتا تو بھی تم سیکھتے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے بھی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تمہارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔" انہوں نے جواباً اس سے کہا۔

ڈاکٹر ویزل کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک صرف جبریل نے دیکھی تھی اور کوئی کبھی مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی کے لیے اتنے مہربان ہو سکتے تھے۔ جبریل کو ان کے ساتھ کام کرنا بھی مشکل نہیں لگا تھا لیکن اب ان کے جانے کے بعد وہ خود ایک سرجن کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کرنے جا رہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس بچے کے دماغ کا آپریشن کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر ویزل کے بالکل برابر میں کھڑا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح گپ شپ کر رہے تھے' اپنے طویل میڈیکل کیریئر کے حوالے سے۔ جب ان کی گفتگو میں پہلی بار جبریل نے کچھ اداسی محسوس کی تھی۔

پھر اس نے ڈاکٹر ویزل کو اوزار سے اس بچے کے دماغ میں بلیڈنگ روکنے کے لیے ایک اور جگہ پر کٹ لگاتے دیکھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جبریل کو کچھ کھٹکا تھا' وہ ان کا ہاتھ چلتے دیکھ رہا تھا لیکن اسے لگا تھا' کچھ غلطی ہوئی تھی۔۔۔ اس کا احساس ٹھیک تھا' وہ بچہ ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ ڈاکٹر ویزل کے پروفیشنل کیریئر کی آخری سرجری ناکام رہی تھی۔۔۔ عائشہ عابدین نے اپنی اکلوتی اولاد کھو دی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)